

فائزہ افتخار
سہارے



سہارے

فائزہ افتخار

"بس..... بہت ہو گیا۔" وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا۔

"آپ لوگ میری کوئی بات سننے پہ تیار ہی نہیں۔"

"واہ..... اب ہم لوگ ہو گئے۔" نیاز احمد نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں جتایا اور ان کی زوجہ محترمہ کے پہلے سے بہتے آنسوؤں کی روانی میں اضافہ ہوا۔

"ابو جان... ! آپ تو میری ہر بات پکڑ لیتے ہیں۔"

وہ زچ ہوا۔ پچھلے کئی روز سے وہ اپنا موقف انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ہر بار یہ گفتگو ایک بے مقصد بحث میں تبدیل ہو جاتی تھی۔

امی جان کا رونا دھونا.....

ابو جان کے طعنے تشنے.....

باجی کے اپنے دکھڑے تھے.....

دکھڑے اس کے بھی کم نہ تھے..... مگر اس کی سنانے کی باری ہی نہ آتی تھی۔ وہ تین ایک طرف تھے' دوسری جانب وہ اکیلا!۔

"میاں ! کیا کریں..... تمہیں پکڑ نہیں سکتے..... اب کیا تمہاری بات بھی نہ پکڑیں..... انگلی پکڑ کے چلنا سکھایا ہے تمہیں۔"

حمزہ کے لبوں پہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ابو جان کا یہ مخصوص فقرہ..... جسے وہ اس کے سامنے تسلسل سے دہراتے رہتے تھے' اسے سن کر ہر بار اسے ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں بننے والی فلموں کی ماؤں کا وہ مشہور زمانہ ڈائیلاگ یاد آجاتا تھا۔

"میں نے نو مہینے اپنی کوکھ میں تمہیں رکھا ہے..... میں تمہیں اپنا دودھ نہیں بخشوں گی اگر تم نے....." وغیرہ وغیرہ۔"

شاید ابو جان بھی اپنا انگلی پکڑ کے چلانا اسے بخشنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کے نیاز احمد چڑ گئے۔

"نا ہنجار' دانت نکال رہا ہے۔"

"آرام سے ابو جان !" باجی نے انہیں دھیما کرنا چاہا۔

"پیار سے سمجھائیں سمجھ جائے گا بچہ ہے۔"

اپنی طرف سے تو انہوں نے حمزہ کی حمایت کی تھی مگر وہ نجانے کیوں تپ گیا۔

"بچہ نہیں ہوں' تین بچوں کا باپ ہوں۔"

"ہم پہ اپنے تین بچوں کا رعب ڈالنے کی ضرورت نہیں۔" نیاز احمد گرجے۔ "جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔"

"کیا مطلب ؟" اس موقع پہ محاورے دانی کا استعمال اسے ذرا سمجھ میں نہ آیا۔

"بھئی ہم نے تو تمہارا ایک ہی بچہ دیکھا ہے۔ باقی کے دو تو تم نے ماں باپ کی نظر بد سے چھپا کے رکھے ہوئے ہیں۔"

ان کی اس بات پہ امی جان کے دکھ جیسے پھر سے ہرے بھرے ہو گئے۔ آنسو کچھ اور تیزی سے بہنے

لگے۔

"اوہو امی جان! آپ تو چپ کریں رو رو کر طبیعت خراب کرلیں گی اپنی۔" اس نے ان کے گرد اپنا بازو لپیٹ کے چپ کرانا چاہا۔

"کون سی نئی بات ہو گی ـــــ طبیعت تو اس کی آئے دن خراب رہتی ہے۔ آج تم بھی دیکھ لینا ـــــ شاید دل پگھل جائے۔"

"اتنی دور گھر ہے میرا ـــــ جب بھی ابو جان کا فون آتا ہے کہ امی ٹھیک نہیں ـــــ فوراً" نکل پڑتی ہوں اور سارا راستہ دل ہولتا رہتا ہے مگر تمہیں کیا۔" باجی نے بھی دبی دبی ناراضی دکھائی۔

"آپ لوگ ایسا کیوں سمجھتے ہیں کہ مجھے اس بات کا کوئی احساس نہیں ہے۔ کیا یہ میری ماں نہیں ہیں؟ کیا میں اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہوں؟ کیا اپنے فرائض پورے نہیں کر رہا؟"

"سات سمندر پار بیٹھ کر تم کون سے فرض ادا کر رہے ہو، میاں ـــــ! ہر مہینے ڈالروں کا ڈرافٹ بھیج دینا ہی سب سے اہم فرض نہیں ہوتا۔"

"سب سے اہم نہ سہی مگر بہرحال فرض تو ہوتا ہے نا ـــــ میں سب چھوڑ چھاڑ یہاں آجاؤں ـــــ دن رات امی کی ٹانگیں دباؤں ان کی گود میں سر رکھ کے لیٹا رہوں ـــــ اپنے ہاتھ سے دوائیں کھلاؤں ـــــ تب آپ خوش رہیں گے؟ چاہے یہ ایک فرض جو آپ کی نظر میں غیر اہم ہے، یہ میں ادا کروں یا نہ کروں ـــــ بتائیے؟ تب گزارا ہو جائے گا؟"

"تم ہو ہی ہٹ دھرم ـــــ ضدی۔" نیاز احمد کے پاس اس سوال کا کبھی بھی کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسے ڈانٹنے لگے۔

"معاف کیجیے گا ابو جان ـــــ مگر جس طرح آپ اپنی ضد پہ اڑے ہوئے ہیں اس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ میں نے اپنی ضد کہاں سے لی ہے۔"

اتنا کہہ کے وہ رکا نہیں اور کمرے سے نکل آیا۔

لاؤنج میں آکر وہ ٹھنڈے پانی کے بڑے بڑے گھونٹ بھرتا اپنے غصے کو کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ اندر سے آتی آوازیں اس کی جھنجلاہٹ میں اضافہ کر رہی تھیں۔

"دیکھی اس کی زبان ـــــ نظروں سے دور رہ کے بدلحاظ ہو گیا ہے۔ سارا امریکہ کے پانی کا اثر ہے۔" ابو جان گرج رہے تھے۔

"رہنے بھی دیں ابو جان ـــــ! ایسا کیا کہہ دیا اس نے" باجی نے پھر حمایت جتائی۔

"آپ نے ابھی بدلحاظ اولادیں دیکھیں نہیں۔ ذرا میرے سسرال آکر دیکھیں ـــــ میرے دیور کیسے بدتمیز اور اکھڑ ہیں ـــــ حمزہ تو اتنا ادب لحاظ والا ہے۔ آپ زیادہ غصہ نہ دلایا کریں اسے آرام سے بات کرکے تو دیکھیں مان جائے گا۔"

"نہیں مانے گا ـــــ تم لکھ لو میری بات ـــــ امریکہ کے جانوروں کی چربی چڑھ گئی ہے اس کی آنکھوں پہ۔"

"لاحول ولا ـــــ" اس نے گلاس میز پہ پٹخا اور گھر سے نکل آیا۔

گیٹ پہ کھڑے ہو کے وہ گہرے گہرے سانس لے کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا اس ماحول سے فی الفور نکل جائے ـــــ مگر کہاں جائے ـــــ پچھلے گیارہ سالوں سے وہ ملک سے باہر تھا اور اس دوران صرف دو بار یہاں آیا تھا۔ ایک بار آٹھ سال پہلے اپنی شادی کے موقع پہ ـــــ دوسری بار پانچ سال پہلے بیوی اور بیٹی کے ساتھ وہ اب تیسری بار ـــــ اکیلا کیونکہ بیوی اور تین بچوں کے ساتھ آتا ایک تو وہ افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرا وہ نہیں چاہتا تھا کہ امی ابو اس کے بچوں کو دیکھ کر اور بھی جذباتی ہوں اور اس پہ یہاں رک جانے کے لیے دباؤ ڈالیں مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ دباؤ وہ اس کے اکیلے آنے کی صورت میں بھی ڈال سکتے ہیں۔

حمزہ اور ہما بس دو ہی بہن بھائی تھے۔ نیاز احمد نے گورنمنٹ سروس عزت اور ایمان داری سے کی تھی۔

اللہ نے بھی اس حلال کمائی میں برکت ڈالی۔ پندرہ سال پہلے انہوں نے ہما کے فرض کی ادائیگی سے فارغ ہوئے تھے۔ حمزہ کا روزگار امریکہ میں لکھا تھا۔ وہ وہاں جا کے بس گیا۔ اب وہ تھے اور ان کی خاموش طبع، حلیم المزاج بیگم ـــــ جو بیٹے کی جدائی میں دن رات تڑپتی رہتی تھیں۔ نیاز احمد کا دل بھی کم نہیں تڑپتا تھا مگر اس دکھ نے ان کے اندر موجود تلخی کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ یوں تو وہ فون پہ بھی اسے وطن لوٹ آنے کی تاکید کرتے رہتے تھے مگر اس بار تو جیسے طے کر کے بیٹھے تھے کہ اسے واپس نہیں جانے دینا۔

"تم یہیں رکو، بیوی بچوں کو بھی بلوا لو ـــــ ورنہ ہمیشہ کے لیے اس لعنتی ملک میں لوٹ جاؤ ـــــ جاتے جاتے زندہ ماں باپ پہ فاتحہ پڑھ کے جانا ـــــ اور پھر بھول جانا کہ یہاں بھی کوئی تمہارا رشتہ باقی ہے ہمیں ڈرافٹ بھیجنے کی غلطی بھی مت کرنا۔"

یہ ان کی نئی ضد اور مطالبہ تھا جسے ماننے سے وہ قاصر تھا۔

کبھی دل چاہتا، صبح صبح چپکے سے ایرپورٹ نکل جائے مگر اپنے باپ کی ضد سے واقف تھا۔ جانتا تھا کہ وہ محض دھمکی نہیں دے رہے۔

مجبوریاں ایک طرف ـــــ مگر اتنا بے حس نہیں تھا کہ ان کو ناراض کر کے جا سکتا۔ سو دن رات یہی کوشش جاری تھی کہ انہیں اپنی مجبوریوں کی تفصیل سنا کر راضی کر سکے۔

دوسری جانب وہ اسے راضی کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

گھر میں چوبیس گھنٹے ایک تناؤ کی کیفیت رہتی۔ اور اس وقت شام سے ذرا پہلے وہ اسی تناؤ کو کم کرنے کی خواہش لیے گیٹ پہ کھڑا تھا۔

وطن سے دور رہنے کی وجہ سے دوستوں سے رابطہ بس برائے نام تھا ـــــ نجانے کون کون کہاں کہاں تھا ـــــ ورنہ کسی پرانے دوست کے ہاں جا کے ہی دھیان بٹا لیتا۔ اس سے اسے اپنی سمجھ دار شریک حیات زویا کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔

اس نے جیب سے سیل فون نکال کر اس کا نمبر ملانا چاہا مگر پھر دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔

"اب اسے کیا پریشان کروں ویسے ہی تین بچوں کے ساتھ پچھلے آٹھ دن سے اکیلی ہے۔"

اس نے ایک گہرا سانس لیا اور سڑک کے پار دیکھنے لگا۔ یہ گھر پارک کے سامنے تھا اور پارک میں اس وقت خاصی چہل پہل تھی ـــــ بچے کھیل رہے تھے ـــــ عورتیں اور مرد جاگنگ ٹریک پہ ٹہل رہے تھے۔

اس کا دل بے قرار وہاں جانے کے لیے مچلا ـــــ اس نے گیٹ بند کیا اور پارک کی جانب چل پڑا۔

☼ ☼ ☼

"رہنے دیں شیخ صاحب! رہنے دیں ـــــ میرا دل نہ جلائیں۔" وہ اپنے خیالوں میں مگن بنچ پہ بیٹھا سامنے جھولا جھولتے بچوں کو غائب دماغی سے دیکھ رہا تھا جب ایک جھنجلائی ہوئی نسوانی آواز نے اسے چونک کر سامنے دیکھنے پہ مجبور کیا۔

اس سے ذرا فاصلے پر موجود بنچ پر وہ دونوں شاید ابھی ابھی آکر بیٹھے تھے کیونکہ کچھ دیر قبل غائب دماغی کی کیفیت میں بھی اسے سامنے کھیلتے رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس بچے صاف نظر آرہے تھے۔

"بیگم صاحبہ! جلی ہوئی چیز کو اور کیا جلایا جائے اب

تواس کو صرف بھسم کیا جا سکتا ہے۔"

اس بار یہ چڑانے والا جواب مرد کی جانب سے آیا تھا۔

حمزہ نے ان کی آوازوں اور پھولے ہوئے سانسوں سے اندازہ لگایا کہ وہ اس کے امی ابو کی عمر کے ہی ہوں گے۔

"مجھے تنگ نہ کریں شیخ صاحب.....! یہ کام آپ کی اولادیں زیادہ اچھی طرح کر لیتی ہیں..... اور جی بھر کے کر لیتی ہیں۔ آپ وہ کیجیے جس کے لیے آئے ہیں جائیں..... جا کے ٹہلیں۔"

"ٹہلیں ؟" مرد نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا جس کے نتیجے میں اسے زور کی کھانسی آ گئی۔

"بس.....؟..... کھل گئی پول بڑے میاں؟" خاتون نے طنز کیا۔

"تمیز سے بیگم صاحبہ.....! اتنا تو سوچ لیا کریں کہ میں کتنے ادب اور تہذیب سے تمہیں بیگم صاحبہ کہہ کر پکارتا ہوں اور تم ہو کہ سرِعام یوں بڑے میاں کہہ کر بدتمیزی کا مظاہرہ کر رہی ہو۔"

"تو مت کہا کریں بیگم صاحبہ..... اتنا خوب صورت نام ہے میرا گل بہار نام سے پکار لیا کریں یا پھر خالی بیگم کہہ لیا کریں۔ اس طرح صاحبہ کا دم چھلا لگانے سے مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑتا' لوگ آپ کے بارے میں ہی غلط فہمی کا شکار ہوں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"یہی سمجھیں گے کہ کوئی ملازم اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ بیٹھا ہے۔"

"تو پھر غلط فہمی کا شکار وہ آپ کے بارے میں ہوں گے بیگم صاحبہ۔" مرد نے بجائے تپ جانے کے ' مزے لیتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے ؟"

"یہی کہیں گے کہ بڑھیا کیسی آزاد خیال اور رنگین مزاج ہے اور کوئی نہیں ملا تو ملازم کے ساتھ پارک میں گھومنے آئی ہوئی ہے۔"

"ارے..... رے..... کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ شرم تو نہیں آتی۔ مجھے تو لگتا ہے بہوؤں کے سارے تعویذ گنڈے آپ پہ الٹے پڑ گئے ہیں۔ آپ کا دماغ گھوم گیا ہے جو میرے بڑھاپے کو رسوا کر رہے ہیں۔ جائیں آپ جا کر ٹہلیں۔"

"پھر ٹہلیں..... ارے بھئی جاگنگ ہوتا ہے۔"

"کوئی بھی جنگ ہو خود جا کر کریں مجھ سے جنگ نہ کریں۔ مجھ سے جنگ کرنے کے لیے آپ کی اولاد اور ان کی بیویوں کا جتھا موجود ہے۔"

"بھئی اب اکیلے تو جاگنگ یا واک ہوتی نہیں ہم سے..... چلو پھر گھر ہی چلیں۔" مرد نے انگڑائی لی۔

حمزہ اس وقت اپنی ساری سوچیں بھلائے ان دونوں عمر رسیدہ میاں بیوی کی دلچسپ نوک جھونک سننے میں محو تھا۔ اس کے امی ابو دونوں میں ایک عمر ساتھ گزار لینے کے بعد بھی ایک جھجک کا پردہ حائل تھا۔ وہ دونوں کبھی بھی اتنی بے تکلفی سے ایسی مزے کی گفتگو نہیں کرتے تھے۔ امی کا مزاج شروع سے دبا ہوا اور صلح جو تھا..... شوہر کی ہاں میں ہاں ملانا ان کی عادت تھی ' دوسری طرف ابو خوامخواہ اپنی ذات کا رعب اور دبدبہ قائم رکھنے کی کوشش میں مصروف رہتے۔

"گھر میں کیا رکھا ہے؟" خاتون نے بے زاری سے کہا۔

"گھر میں.....؟" مرد جیسے سوچ میں پڑ گیا۔

"گھر میں ہمارے دو بیٹے..... ہمارے بڑھاپے کا سہارا..... ان کی دو عدد بیویاں..... ہمارے ارمانوں سے لائی اور تمہاری نخروں سے پسند کی گئی بہوئیں ہمارے چار پوتے اور دو پوتیاں اور آج ہفتہ ہے شاید ہمارے بیٹی بھی آئی ہو۔ اس طرح گھر میں دو عدد بیٹوں ' دو عدد بہوؤں اور چھ عدد پوتے پوتیوں کے علاوہ ایک عدد بیٹی ' ایک عدد داماد اور دو عدد نواسوں کی موجودگی کا بھی امکان ہے۔"

"بس بس اپنے اعداد و شمار رہنے دیں شیخ صاحب! مجھے نہیں جانا گھر۔ ابھی ایک گھنٹہ بھی تو نہیں ہوا ہمیں گھر سے نکلے۔ میرا دل نہیں چاہ رہا اتنی جلدی اس چخ چخ میں جانے کو۔"

"ایسا مت کہیں بیگم صاحبہ! جو بھی ہے وہ ہمارا گھر ہے۔ ہمارے بچے ہیں۔ ہمارے بچوں کے بچے ہیں۔"

"یہ بات وہ کیوں نہیں سمجھتے شیخ صاحب!" پہلی بار خاتون کی کھنکتی آواز میں افسردگی گھلی ہوئی محسوس ہوئی۔

"سمجھ جائیں گے۔"

"وہ صرف اپنی بیویوں کی زبان سمجھتے ہیں۔"

"کہتے ہیں بچہ پیار کی زبان سمجھتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی بیویوں نے ان سے پیار کی زبان بولی اور اپنا بنا لیا..... آپ بھی کچھ میٹھے بول بول کے دیکھیں بیگم صاحبہ!"

"ہاں ہاں..... میں نے تو جیسے بندوق کی نوک پہ رکھ کے پالا ہے انہیں۔ آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں شیخ صاحب!" وہ شاید برا مان گئیں۔

"یہ صرف بیوی کا پیار سمجھنے کے قابل رہ گئے ہیں۔ بس جو وہ کہہ دیں..... وہی سچ ہے۔"

"کچھ سمجھوتا تم بھی کر لو..... بدلتے وقت کے بدلتے تقاضوں کے آگے سر جھکا لینا چاہیے۔"

"میں کیوں سر جھکاؤں؟ وہ چھوٹے ہیں..... وہ سر جھکائیں..... غضب خدا کا..... ماں باپ ہو کر ہم ان کے آگے جھکیں..... اس گھر کا ماحول ٹھیک رہے..... بہوؤں کے تھوبڑے نہ بنا کریں۔ اس کے لیے میں کیا نہیں کرتی۔ اپنا اور آپ کا ناشتہ خود بناتی ہوں کہ ہمیں عادت ہے نماز کے فوراً بعد ناشتہ کرنے کی..... اور وہ کلموہیاں دن چڑھے تک بستر پہ اینڈنے کی عادی۔ ان کی نیند خراب نہ ہو اس لیے نہ صرف اپنا اور آپ کا ناشتہ بناتی ہوں بلکہ اسکول جانے والے دونوں بچوں کا ناشتہ اور ساتھ دینے والا لنچ بھی۔ یہ میں اپنی بہوؤں پہ احسان نہیں کرتی جو جتایا جائے۔ میرے پوتا اور پوتی ہیں وہ..... میں خوشی خوشی ان کے سارے کام کروں..... مگر بدلے میں شکریہ نہ سہی..... تھوڑا سا پیار تو دیں۔ پھر بھی منہ سوجے رہتے ہیں۔ ایک وقت کا کھانا بھی بناتی ہوں۔ اکثر کچھ نہ کچھ میٹھا بنا دیتی ہوں۔ ان دونوں کو تو توفیق نہیں ہوتی کبھی میٹھا بنانے کی..... ایک وقت کی سبزی ہی کچی پکی بھون دیں تو غنیمت جانو..... نہ کبھی کوئی کپڑا استری کر کے دیا نہ کبھی سر دبانے کو کہا اللہ کا شکر ہے آپ کی پنشن اور میرے ابا کے مکان کا کرایہ آتا ہے..... خود ملازم کی تنخواہ دیتے ہیں اور بغیر کسی کی محتاجی کے زندگی گزار رہے ہیں۔ وہی کپڑے دھو کر استری کر کے دے دیتا ہے..... ہسپتال جانا ہو تو لے جاتا ہے۔ چھوٹے بڑے کئی کام کر دیتا ہے..... صرف اس لیے کہ بارہ سو روپیہ مہینہ دیتے ہیں ہم۔ سوچیے اگر نہ دے پاتے تو آج ہمارا بڑھاپا کس قدر خوار ہو رہا ہوتا۔ ان بے فیضوں کے آسرے پہ پڑے ہوتے..... شکر ہے اللہ تعالیٰ کا کہ اس نے ان کا محتاج نہیں کیا مگر کیا بے بسی ہے..... دل تو اب بھی ان کا محتاج ہے ان کی توجہ اور محبت کا بھوکا..... ہمیشہ کا ضرورت مند....."

"اس پہ شکر کرو کہ بچے تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں..... صحت مند ہیں کھاتے کماتے اور مگن ہیں اپنی اپنی زندگی میں سیٹ ہیں اور ہمیں اس عمر میں کیا چاہیے۔ کم از کم ہمیں اب کسی اولاد کی جانب سے کوئی فکر تو نہیں رہی۔ ایک بیٹا شہر کا مشہور ہارٹ اسپیشلسٹ ہے۔ دوسرا شہر کا سب سے قابل وکیل..... ایک بہو اعلا تعلیم یافتہ ' دوسری ذرا کم مگر حسن و خوب صورتی میں اپنی مثال آپ..... سب کہتے ہیں کہ ایسی بیویاں پا کر میرے دونوں بیٹوں کی زندگیاں سنور گئیں۔"

"ہونہہ....." خاتون نے سر جھٹکا۔

"اور اللہ کے فضل سے دونوں صاحب اولاد بھی ہیں اور ہماری اکلوتی بیٹی ہماری پیاری بیٹی وہ بھی اپنے گھر میں خوش اور مطمئن ہے۔"

"ہاں اتنی خوش..... اتنی مطمئن کہ ماں باپ کو بھلا ہی دیا ہے اس نے اب اس کا سب کچھ اس کا شوہر ' اس کے بچے اور اس کا سسرال ہے۔ وہی اس کی زندگی ہے۔ ہم تو جیسے کچھ ہیں ہی نہیں۔"

"کم عقل عورت.....! زندگی کے کسی معاملے پہ تو اللہ کا شکر کرنا سیکھو۔ لوگ بیٹیوں کے لیے یہ دعائیں

مانگتے ہیں کہ وہ اپنے سسرال میں اتنی مگن ہو جائیں کہ انہیں میکے کی یاد تک نہ آئے اور تم اس بات پہ مسرور ہونے کے بجائے الٹا اس سے شاکی ہو۔"

"تو کیا کروں شیخ صاحب! آپ جیسا دل نہیں ہے میرا جو درد برداشت بھی کرے اور پھر اس کے ہونے سے انکار بھی کرے۔ سچ کہیں کیا آپ کو بیٹی کی یاد نہیں آتی؟ آپ کا دل نہیں چاہتا' ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے وہ مہینے میں کم از کم دو بار تو ہم سے مل جایا کرے۔ ہم تنہائی کے مارے بوڑھے لوگ' گھر میں نو نو لوگوں کے ہوتے ہوئے سارا سارا دن ٹکر ٹکر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے والے۔۔۔ ہمیں تھوڑا سا وقت دے دیا کرے کیا فرق ہے پھر اس میں اور ہماری دونوں بہوؤں میں ان کے پاس بھی ہمارے لیے وقت نہیں ہے۔ بیٹی کے پاس بھی نہیں ہے۔"

"خود کو مصروف رکھنے کے سو بہانے ہیں۔۔۔ ہزاروں طریقے ہیں۔ صرف اولاد کا منہ دیکھنا چھوڑ دیں بیگم صاحبہ!"

"کون سے طریقے؟۔۔۔ وہ جو آپ نے اپنا رکھے ہیں۔ اخباروں کے منحوس معمے حل کرتے رہنا۔۔۔ ٹی وی پہ لگنے والے بکواس ترین بحث و مباحثہ کے سیاسی پروگرام دیکھنا۔۔۔ پرانے دوستوں کے ساتھ شطرنج کھیل کھیل کر دماغ میں خشکی پیدا کرنا۔۔۔ میں باز آئی ایسے مشغلوں سے اور ویسے بھی ان سے آپ کو کیا فائدہ ہوا ہے۔ جو مجھے ہوگا؟"

"کیوں نہیں ہوتا فائدہ؟ تمہاری طرح بے کار بیٹھا فضول واہمے نہیں پالتا رہتا نہ الٹا سیدھا سوچ کر نفسیاتی مریض بنتا جا رہا ہوں۔"

"نفسیاتی نہ سہی مگر مریض تو بن گئے ہیں۔ وہ ہارٹ اٹیک ایسے ہی نہیں ہو گیا تھا بس رہنے دیجیے شیخ صاحب! کسی اور کے سامنے خود پہ پردے ڈالیے گا مجھے مت بنائیے زندگی کے چھتیس سال گزار لیے ہیں آپ کے ساتھ کیا میں نہیں جانتی کہ اوپر سے مضبوط بنے رہنے کے باوجود آپ اندر سے مجھ سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔ میں بول بول کر۔۔۔ یا بہت دل بھر جائے تو رو دھو کر اپنی بھڑاس نکال لیا کرتی ہوں مگر آپ نے ہر غم اندر ہی اندر اتار کے خود کو دل کا مریض بنا لیا ہے۔ بیٹوں کی بے اعتنائی' بہوؤں کی لاپروائی اور بیٹی کی خود غرضی ان سب نے آپ کو بھی اتنا ہی دکھ پہنچایا ہے جانتا مجھے۔"

"مگر میں تمہاری طرح اپنے دکھوں کے اشتہار نہیں چپکاتا پھر رہا۔" وہ چڑ کے بولے۔

"میں بھی دل کی بات صرف آپ سے کر رہی ہوں' ڈھنڈورا نہیں پیٹ رہی۔ کیا اب انسان شریک زندگی سے بھی دکھ سکھ نہ بانٹے۔"

"ضرور بانٹو۔۔۔ مگر دکھ اور سکھ دونوں۔۔۔ سکھ تو پتہ نہیں کہاں اکیلے اکیلے اڑا آتی ہو۔۔۔ دکھوں میں میرا حصہ فوراً" لے کر آ جاتی ہو۔"

حمزہ ایک بار پھر مسکرا دیا۔ حالانکہ اس کا دل ان خاتون سے ہمدردی محسوس کرتا بے حد گداز ہو رہا تھا۔

"چلیں اب گھر چلیں بچے پریشان ہو رہے ہوں گے کہ بڈھا بڑھیا کہاں موج اڑا رہے ہیں۔"

"لو۔۔۔ ابھی ان کی لاپروائی اور بے اعتنائی کے رونے رو رہی تھیں' کہاں یہ کہہ رہی ہو کہ وہ فکر مند ہو رہے ہوں گے۔"

"فکر مند نہیں' صرف پریشان ہو رہے ہوں گے وہ بھی اس لیے نہیں کہ ہمیں کچھ ہو نہ جائے بلکہ اس لیے کہ گھر کے بہت سے کام رکے ہوں گے۔ بچے ماؤں کے سر چڑھ کے ہلا مچا رہے ہوں گے۔ انہیں سنبھالنے کے لیے آپ جو ہیں' آپ کی راہ تک رہی ہوں گی آپ کی چہیتی بہوئیں کہ آپ آئیں اور وہ آپ کے سر پہ اپنے بچے چھوڑیں۔۔۔ کوئی سودا سلف منگوانا ہو تب بھی' آپ موجود' ظاہر ہے ملازم قابل بھروسہ جو ہیں' ڈنڈی مار دے گا پیسوں میں بھی اور سودے میں بھی۔ رہی میں' تو جب تک میں سبزی نہ کاٹ کے دوں گوشت دھو کر نہ رکھوں' بیگم صاحبہ کھانا نہیں پکاتیں۔ آج تو میٹھا بنانے کے لیے بھی مجھے ہی کہا ہے۔ بس اب چلیں گھر۔۔۔ ورنہ ساری اولاد مل کے ہماری قصیدہ گوئی کر رہی ہوگی۔"

"ہاں بھئی چلو۔۔۔" وہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے

اٹھے۔

بشاش بشاش لہجہ تھکن لیے ہوئے تھا۔ جیسے گھر واپس جانے کے خیال سے دل بجھ گیا ہو۔ حمزہ کو لگا' خاتون کی تمام شکایتیں بجا تھیں اور ان کے شوہر صرف ان کا دھیان بٹانے اور دکھ کم کرنے کے لیے اسے ان کا وہم اور غلط فہمی قرار دے رہے تھے ورنہ دل سے وہ بھی شاید اپنے بچوں کے لیے بہت سے گلے رکھتے ہوں گے۔ گھر واپس جانے کے خیال سے بجھتا چہرہ ٹوٹتا لہجہ اور تھکے تھکے قدم اس بات کے گواہ تھے۔

"ہاں۔۔۔ گھر تو اپنا ہی ہے۔ کب تک فرار حاصل کر سکتے ہیں۔ آخر جانا تو وہیں ہے۔"

خاتون بھی اٹھ گئیں اور گہری سانس لے کر تازہ ہوا اپنے اندر اتاری جیسے کسی گھٹن زدہ کوٹھڑی میں جانے سے پہلے اپنے اندر توانائی بھر رہی ہوں۔

"گھر بھی اپنا ہے اور گھر والے بھی۔۔۔ جیسے بھی ہیں' ہمارے اپنے بچے ہیں وہ۔" بیگم کا ہاتھ پکڑ کے وہ آگے بڑھے۔

"یہی تو زندگی ہے بیگم۔۔۔! ہمارے بیٹے' بہوئیں۔۔۔ پوتے' پوتیاں' نواسا' نواسی' بیٹی' داماد کم از کم گھر بھرا ہوا تو ہے' چاہے وہ۔۔۔"

"رہنے دیں شیخ صاحب! خود کو دھوکا دینا بند کریں۔ میں بھی تنگ آ چکی ہوں اپنے آپ کو یہی سب کہہ کر بہلاتے ہوئے۔"

ان کے جاتے جاتے کہے یہ آخری فقرے حمزہ کے کانوں میں گئے اور وہ بھی اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔

ان کے پیچھے پیچھے سست روی سے چلتے ہوئے وہ بہت کچھ سوچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ یہ کیوں سوچتے ہیں کہ مجھے یہاں باندھ کے رکھ لینے سے آپ کو بہت سکھ مل جائے گا۔ فرض کیجیے' میں آپ کی ضد مان کے یہاں آ بھی جاؤں اپنی لگی لگائی ملازمت چھوڑ بھی دوں تو یہاں آ کر کروں گا کیا؟ جمع جتھا تو میرے پاس کوئی ہے نہیں' تعلیم ایسی

نہیں کہ آتے ہی تیس چالیس ہزار ماہانہ والی تنخواہ مل جائے کاروبار کا نہ تجربہ ہے نہ سرمایہ میری تو زندگی برباد ہو گی ہی آپ بتایئے آپ کو کیا ملے گا؟ ابھی میں بیس سے تیس ہزار ماہانہ آپ کو خرچا بھیجتا ہوں' آپ نے فل ٹائم ملازم رکھا ہوا ہے' ہر سہولت' اچھے سے اچھا علاج مہیا ہے۔ تب کیا ہو گا' اپنے بچے پالوں گا یا یہ گھر چلاؤں گا؟"

اس نے راستے میں یاد کیا ہوا سبق کسی رٹو طوطے کی طرح دُہرانا شروع کیا۔ حالانکہ شام کو اس نے طے کیا تھا کہ اب وہ اس موضوع پہ ابوجان سے کوئی بات نہیں کرے گا کیونکہ وہ کچھ سننے پہ تیار ہی نہ تھے۔ لیکن اب اس کے سامنے سوچ کا ایک نیا در کھلا تھا اور اس نے اسی زاویے سے انہیں سمجھانا چاہا تھا۔ یہ الگ بات کہ نیاز احمد نے اس کی تقریر کا صرف ابتدائی اور تمہیدی حصہ سن کر ہی ٹوک دیا۔

"رزق کی کمی کا رونا مت روؤ..... جتنا نصیب میں لکھا ہو اتنا ہی ملتا ہے اور ہر جگہ ملتا ہے۔ اگر تمہارے نصیب میں اللہ نے رزق کی برکت لکھی ہے تو چاہے پاکستان آ کے ہی رہ جاؤ..... برکت برکت ہی رہے گی اور اگر خدانخواستہ تنگی لکھی ہے تو وہ ڈالروں پونڈوں والے ملکوں میں بھی سہنی پڑ سکتی ہے۔ یہ سب بے کار باتیں ہیں۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم اس آخری عمر میں تمہیں اور تمہارے بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان دنوں کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سکھ دیکھنا ہمارا حق ہے۔"

"آپ کی یہی غلط فہمی تو میں دور کرنا چاہتا ہوں کہ قریب ہونے میں ہی سکھ ہے۔ میں سات سمندر پار ہوں مگر میرے بچوں کا میری بہن کے بچوں سے روز رات ہی نیٹ پہ رابطہ رہتا ہے۔ میں ہفتے میں تین بار آپ کو ایک ایک گھنٹے کا فون کرتا ہوں۔ آپ میرے لیے..... اور میں آپ دونوں کے لیے فکر مند رہتا ہوں۔ محبت کرنے اور خیال رکھنے کے لیے ساتھ رہنا ضروری نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ سب لوگ بھی سکھی ہوتے جو بیٹوں بہوؤں کے جمگھٹے میں رہتے ہیں۔ دور کیوں جایئے..... اپنے دوست وکیل قیصر کے نئے کرائے داروں کو ہی لیجیے۔"

نیاز احمد چونکے۔

"ان کا یہاں کیا ذکر اور تم کیسے جانتے ہو انہیں؟"

"آج شام کو ہی ملا تھا شیخ صاحب سے آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ وہ کتنے بھرے پرے خاندان والے ہیں مگر کبھی آپ اپنی اور ان کی زندگی کا موازنہ کیجیے..... اور پھر انصاف سے کام لیتے ہوئے مجھے بتایئے کہ کیا آپ ان سے بہتر حال میں نہیں ہے؟"

نیاز احمد نے اپنی بیگم کو دیکھا۔ وہ بھی کچھ سوچتے ہوئے اپنے آنسو صاف کرنے لگیں۔

"حمزہ ٹھیک کہہ رہا ہے حمزہ کے ابو۔! ان کے مقابلے میں ہم بہتر ہی نہیں خوش نصیب بھی ہیں۔"

"مگر....." وہ کچھ کہنے لگے پھر سر جھٹک کے خاموش ہو رہے۔ ان کی خاموشی نے حمزہ کا حوصلہ بڑھایا کہ کوئی بات تو ایسی ہے جو اس کے ابو جان کو بحث کرنے پہ مجبور کر سکتی ہے۔

"سو فیصد خوش نصیب ہیں۔ انہیں دیکھ لیں' بیٹے بھی پاس ہیں' بہوئیں بھی..... پوتے پوتیوں سے گھر بھرا ہے مگر دونوں کتنے اکیلے ہیں۔ سکون حاصل کرنے کے لیے گھر سے فرار حاصل کرتے ہیں اور باہر پناہ تلاشتے پھرتے ہیں۔"

نیاز احمد اور ان کی بیگم دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھا۔ نیاز احمد نے ایک گہری سانس لی۔

"تم صحیح ہو حمزہ...! واقعی ہم ان کے مقابلے میں لاکھ درجے خوش قسمت ہیں ہمارا بیٹا ہم سے سات سمندر پار ہے' سالوں بعد شکل دکھاتا ہے ہماری بیٹی چاہنے کے باوجود کئی کئی دن ہم سے ملنے نہیں آ سکتی کیونکہ وہ اپنے بال بچوں اور سسرال میں مصروف ہے۔ مگر ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارا بیٹا دور سہی..... بیٹی مصروف اور ذمہ دار سہی مگر ہے تو سہی بے چارے شیخ صاحب اور ان کی بیگم جن کا تم تذکرہ کر رہے ہو وہ تو اس نعمت سے ہی محروم ہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"بے اولاد ہیں دونوں۔"

"مم..... مگر۔" اس انکشاف نے اسے ہکا بکا کر دیا۔

"وہ تو..... میں نے خود سنا..... وہ دو بیٹے چار پوتے ..... بیٹی داماد..... وہ نواسی۔" وہ ہکلانے لگا۔

"یہاں آئے انہیں دو سال ہونے والے ہیں۔ آتے ہی سب کو انہوں نے یہی سب بتایا تھا جو تم جانتے ہو مگر جلد ہی سب حقیقت جان گئے۔ وہ بے اولاد ہیں اور شادی کے پینتیس سال بعد یہ محرومی جیسے ان کے اندر تک اتر کے انہیں ذہنی مریض بنا چکی ہے۔ وہ ایک نارمل زندگی جی رہے ہیں..... ہر اعتبار سے نارمل..... مگر اس ایک معاملے میں وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہوئے ایک خیالی زندگی جی رہے ہیں۔"

حمزہ ٹکر ٹکر ابو جان کی شکل دیکھنے لگا جو اسے حیران کر رہے تھے۔

"میں ایک بار ان سے ملنے گئی تو بے چاری رسالوں میں سے تصویریں کاٹ کاٹ کر البم میں لگا رہی تھیں ..... کہ میرا نواسا ہوتا تو بالکل ایسا ہوتا۔ پوتی ہوتی تو ایسی ہی پونیاں بناتی بالوں کی..... میرب ہوتی تو ایسا ہی سونے کا سیٹ بنواتی اس کا' اس کے بعد دوبارہ جانا ہوا تو یہ سب تصاویر فریم ہو کر دیواروں پہ لگی تھیں وہ بھی اور چند ایک دوسری بھی اور ان سب سے تعارف انہوں نے یہی کہہ کر کروایا کہ یہ ان کے بیٹے بیٹی' بہوویں اور ان کے بچوں کی تصویریں ہیں۔"

"شاید وہ خود کو یہی دھوکا دیتے ہوں کہ اگر ہمارے بچے ہوتے تو ہم یہی زندگی جی رہے ہوتے۔ ناقدری کی ..... محرومی کی' وہ خود کو یہ احساس دلانا چاہتے ہوں کہ اولاد کے نہ ہونے سے انہیں وہ دکھ بھی جھیلنا نہیں پڑے جو بری اولاد کے ہوتے ہوئے سہنا پڑتے ہیں۔ چلو' ایک دھوکا آج کے بعد ہم بھی خود کو دے لیا کریں گے۔ ایک دوسرے کو یہ کہہ کر بہلا لیا کریں گے کہ....."

نیاز احمد کی آواز بھرا گئی اور وہ بھیگی پلکیں مسلتے ہوئے باہر نکل گئے۔

حمزہ کی تیاریاں مکمل تھیں..... وہ اسی ڈیٹ کو واپس جا رہا تھا جس ڈیٹ کی سیٹ اس نے کنفرم کرائی تھی۔ امی جان کے لاکھ کہنے پہ بھی اس نے سیٹ آگے نہیں کروائی تھی۔

ایئرپورٹ تک بھی اس کے ماتھے پہ ایک الوداعی بوسہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"کیا تھا جو میرے کہنے پہ تم ایک ہفتہ اور رک جاتے تو..... کچھ دن اور میرے کلیجے میں ٹھنڈ رہ جاتی۔"

"بس بھی کرو کلثوم بی بی....! جاتے وقت اس کا دل برا مت کرو۔"

حمزہ نے حیرت سے دیکھا۔

یہ بات کہتے نیاز احمد جتنے عجیب لگ رہے تھے اتنے ہی افسردہ۔

"اسے جانا ہی ہے..... چاہے ابھی جائے چاہے ہفتہ بھر بعد..... جانا تو ہے ہی۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہیں ابو جان! مجھے جانا تو ہے ہی ..... پھر ایک ہفتہ اور رکوں یا نہ رکوں' کیا فرق پڑتا ہے جلدی جاؤں گا تو جلدی واپس آؤں گا نا۔" اس کی بات پہ امی جان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"اس بار تم جلدی واپس آؤ گے؟"

"جی..... بہت جلدی نہ صرف میں بلکہ زویا اور بچے بھی۔"

"سچ کہہ رہے ہو حمزہ.....؟"

"ہاں..... مگر مجھے اس کے لیے کچھ وقت چاہیے ..... بس ڈیڑھ دو سال اس کے بعد میں فیملی لے کر ہمیشہ کے لیے یہاں جاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

نیاز احمد نے اسے سینے سے لگا لیا۔

"کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا' اس پارک کے کسی اور بینچ پہ شیخ صاحب اور ان کی بیگم کی طرح میرے ماں باپ بھی اپنے بڑھاپے اور تنہائی کو خود فریبی کے سہارے دے رہے ہوں۔"

اس نے ان کے گلے لگتے ہوئے سوچا۔